درکار ہے۔ اس میں جدا جدا رائیں ہیں، پانچ شرائط بہر آئینہ اس سلسلہ میں بالعموم ذکر کی جاتی ہیں :۔

(۱) کتاب وسنّت کے نصوص کا کامل علم :۔

نصوص سے مراد وہی تصریحات ہیں جو احکام سے متعلق ہیں ——— عام اندازہ یہ ہے، کہ قرآن میں ایسی آیات کل پانچ سو ہیں لیکن یہ تعداد آخری اور قطعی نہیں ہوسکتی۔ ماوردی کا کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اوّل اس مقدار کی طرف فقہا و اصولیین کا ذہن یوں منتقل ہوا، کہ مقاتل بن سلیمان نے آیاتِ احکام پر جو کتاب لکھی اس میں پانچ صد آیات ہی کا اندراج کیا ——— حالانکہ قرآن حکیم کا اسلوب اظہار یہی نہیں کہ وہ احکام و اوامر کو براہ راست اوامر و احکام ہی کے سیاق میں بیان کرے بلکہ وہ قصص و امثال کے انداز میں بھی بسا اوقات ایسی گراں قدر حقیقتوں کی طرف اشارہ کر جاتا ہے، جن پر مسائل و فروع کی پوری عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے ——— اس لئے آیاتِ قرآنی سے متعلق اتنی واقفیت ہونی چاہیئے کہ اس سے یہ معلوم کرنے میں زحمت نہ ہو کہ زیر بحث مسئلہ کی چھان بین کے لئے قرآن کے کس کس حصّہ کا مطالعہ ضروری ہے۔

سنّت میں سے مجتہد کے لئے کتنی احادیث کا جاننا ضروری ہے اس میں بھی نزاع ہے ——— ایک رائے یہ ہے کہ پانصد حدیثیں جان لینا کافی ہے۔ کیونکہ احکام و مسائل کی احادیث اس سے زیادہ نہیں ——— ابن العربی کا کہنا ہے کہ احکام سے متعلقہ احادیث تین ہزار سے کسی طرح بھی کم نہیں ——— ایک روایت میں ہے کہ امام احمد سے جب پوچھا گیا کہ اجتہاد کے لئے کس قدر احادیث کا علم ہونا ضروری ہے۔ کیا ایک لاکھ کا؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر پوچھا گیا کیا دو لاکھ کافی رہینگی؟ جواب دیا نہیں۔ جب کہا گیا، کہ پانچ لاکھ، تو فرمایا: اَرجُوا (ارشاد الفحول) ہاں اتنا غنیمت ہے۔

لیکن خود امام احمد کے بعض اصحاب کا قول ہے کہ یہ بہ بتائے احتیاط ہے، کیونکہ امام احمد ہی نے ایک جگہ تصریح فرمائی ہے۔ کہ کل بارہ سو حدیثیں ایسی ہیں، جن کے گرد تمام فروع و مسائل گھومتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے، کہ اجتہاد کے لئے جیسے قرآن کے بارے میں اتنا علم کافی ہے کہ مواقع استدلال اور موارد استنباط نظر سے اوجھل نہ ہوں اور ضرورت کے وقت ان سے استفادہ کیا جاسکے، اسی طرح احادیث کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کی سب یاد ہوں، یا ہزاروں اور لاکھوں ازبر ہوں، بلکہ اتنا کافی ہے، کہ ایک شخص عند الضرورت یہ جان سکے، کہ زیر تحقیق جزئی کیلئے مجھے کن کن احادیث کی ورق گردانی کرنا پڑے گی۔ اور کس کس باب سے حسب منشا مواد مل سکے گا۔

اصل چیز قدرت و استطاعت ہے ——— اور یہ جاننا ہے، کہ محدثین کے ہاں کتب حدیث کی ترتیب کیا ہے، کون صحیح ہیں اور کون اصح نہیں، اور اس فن میں انکی کیا کیا اصطلاحات ہیں یعنی جب وہ کسی حدیث کو صحیح کہتے ہیں تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے اور جب حسن کہتے ہیں، تو اس سے کیا مقصد ہوتا ہے۔

احادیث سے بھی زیادہ خود مزاج نبوت سے سازگاری ضروری ہے اور یہ جاننا اہم ہے، کہ آنحضرتؐ کے نزدیک خیر و شر اور عدل و ظلم کا وسیع ترین اور عمل حیات سے قریب تر کیا معیار تھا تقنین و تشریع میں آپ نے کن نزاکتوں کو ملحوظ و مرعی رکھا ہے، ——— ہمارا مقصد اس سے

یہ نہیں کہ یہ مزاج نبوت احادیث سے کوئی الگ شئے ہے، بلکہ یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ زیر بحث ہو تو اس پر کئی سمتوں سے غور کیا جائے اور بالخصوص جس چیز پر نظر رہے، وہ یہ ہے، کہ ذوق نبوت اور حکمت رسالت کن باتوں کی متقاضی ہے ——

(۲) مسائل اجماعیہ سے واقفیت :—

یعنی یہ جاننا کہ امت کن مسائل پر پہلے سے متفق ہے، اور کہاں سے اجتہاد و فکر کا آغاز ہونا چاہیئے —— اجماع کی دینی حیثیت اور حدود سے متعلق تصریحات اجماع کے باب میں گزر چکی ہیں۔

(۳) علوم لسانی پر عبور :—

یہ شرط سب سے اہم ہے، کیونکہ اگر ایک شخص عربی صرف و نحو کو نہیں جانتا، معانی و بیان کے رموز و اسرار سے واقف نہیں اور اس کا فنی، ادبی لطائف سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیتیں نہیں رکھتا تو وہ قطعی اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ پہلے ہی قدم پر ناکام رہے گا —— عربی زبان ادائے مطلب کیلئے اپنا مخصوص سانچہ رکھتی ہے، چنانچہ ایک اعراب کی تبدیلی اور ایک لفظ کے تقدم و تاخر سے یہاں معانی کے چہرہ پر ایسے ایسے تغیرات رونما ہوتے ہیں، کہ جن کو وہی کچھ جان سکتا ہے، جو اس کی اداؤں سے کماحقہ واقف ہے اور اس کے تیوروں کو پہچانتا ہے —— بالخصوص اس دور میں جبکہ اجتہاد کی اذان انہوں نے ہر جاہل کو اور زبان و ادب سے نابلد کو اجتہاد و قیاس پر جسور کر دیا ہے، یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے، کہ زبان و ادب کی اہمیتوں کو فراموش نہ کیا جائے۔

ایسے لوگ جو بغیر عربی جانے اور پڑھے مستقل اجتہاد فرماتے ہیں، انھیں قدرے اپنے حدود کا جائزہ لینا چاہئے اور دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان کے پاس علم و فضل کی اتنی پونجی ہے، کہ اس کی روشنی میں آگے بڑھ سکیں —— یہ معمولی کام نہیں کہ ہر شخص اس سے عہدہ برآ ہو سکے، بلکہ یہ علم و معرفت کی وہ آخری منزل ہے جس کی سرحدات تعلیم نبوت سے ٹکراتی ہیں —— یہ یاد رہے، کہ علم کے تین درجے ہیں، پہلا یہ ہے، کہ ہر ہر مسلمان اتنی عربی جانتا ہو کہ اپنے آپ روزمرہ کی دینی ضرورتوں کو سمجھ سکے، یہ وہ درجہ ہے جس کی طرف ماوردی نے ان الفاظ میں ارشارہ کیا ہے :

معرفت لسان العرب فرض علی کل مسلم من مجتہد و غیرہ۔ (ارشاد)

زبان عربی کا جاننا مجتہد و غیر مجتہد، ہر عامی مسلمان پر فرض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پورے دینی ڈھانچہ پر تفصیلی نظر ہو، اور یہ معلوم ہو کہ ہمارا دین کیا ہے، اسکی عبادت کس ڈھب کی ہے؟ عقائد کیا ہیں اور اخلاق و معاشرت کی کیا نوعیت ہے، اس درجہ پر کمیت و کیف کے ساتھ ہر عالم کو فائز ہونا چاہیئے۔

تیسرا درجہ اجتہاد کا ہے جو اچھے خاصے عالم سے کچھ آگے کا مقام ہے، اب سوچ لیجئے کہ اس منصب جلیل کیلئے زبان و ادب کا جاننا کتنا ضروری ہے —— جب ماوردی کا ایک عام مسلمان سے متعلق یہ تصور ہے کہ اسے عربیت سے ایک طرح کا لگاؤ ضرور ہونا چاہیئے، تو مجتہد کے بارے میں ان کا معیار کتنا اونچا ہوگا۔

(۴) اصول فقہ پر نظر :—— زبان کے بعد دوسرے درجہ کی چیز یہ ہے، اجتہاد ہمارے ہاں چونکہ محض اٹکل اور

قیاس آرائی کا نام نہیں۔ بلکہ اس کے کچھ لگے بندھے اصول ہیں اور بھی تلی بنیادیں ہیں۔ اسلئے مجتہد کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان سب علوم سے واقف ہو مزید براں تاریخ، فقہ اور ائمہ و مجتہدین کے مسلک و دلائل سے بھی آگاہ ہو، اور یہ خوب جانتا ہو کہ کن کن مسائل میں فقہائے عظام نے تعمیم و اطلاق کی کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں ——— ہمارے معاشرہ میں گذشتہ صدیوں میں اگرچہ تیزی سے حالات کی تبدیلی نہیں ہوئی اور ایسے بنیادی تغیرات رونما نہیں ہوئے، کہ فقہ و قیاس کی بنیادیں اس سے متاثر ہوں، تاہم تشریح مسائل اور غور و فکر کے انداز میں تسلسل ضرور پایا جاتا ہے ——— اس لئے ایک مجتہد کیلئے لازم ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے اور مسائل پر غور و فکر کرتے وقت یہ دیکھ لے کہ ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے اجتہاد و رائے کی کتنی بڑی دولت چھوڑی ہے ——— اور ہمیں اس میں کیا اضافہ کرنا ہے۔

(۵) ناسخ و منسوخ کا علم: ——— یہ شرط اگرچہ بہت ضروری ہے، تاہم کتاب و سنت کے علم میں مندرج ہے، کیونکہ ایک شخص اس وقت تک عالم سنت ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ کون احکام پہلے کے ہیں اور کون بعد کے۔

دو اور شرطوں کا اضافہ:۔ ان پانچ شرطوں پر ہم صرف دو کا اور اضافہ کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ مجتہد جدید طرز زندگی سے بھی آگاہ ہو، اور یہ جانتا ہو کہ اقتصادات و سیاسیات کے کون کون عوامل ہمارے پورے معاشرہ کو متاثر کئے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ عین ممکن ہے، کہ ایک آدمی کتاب و سنت کے نقطۂ نظر سے خوب آگاہ ہو، فقہائے ماسبق کی موشگافیوں کو بھی خوب جانتا ہو۔ لیکن اقتصادیات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک معمولی مسئلہ پر بھی صحیح رائے نہ پیش کر سکے، اور یہ نہ بتا سکے، کہ موجودہ حالات میں اسلام کے حکیمانہ تقاضے کس چیز کے مقتضی ہیں ———

دوسرے یہ کہ مجتہد غیر معمولی ذہنی سلجھاؤ رکھتا ہو ——— اور اس لائق ہو کہ زیر بحث مسئلہ پر ان تمام سمتوں سے غور و فکر کر سکے، جو اس سلسلہ میں گتھی کو سلجھانے میں ممد و معاون ہو سکیں ——— اس سے پہلے جن شرطوں کا تذکرہ ہوا ہے، وہ علم کی ہیں، اور علم سے بھی پہلے عقل و فکر کا درجہ ہے۔ اس لئے مجتہد کے لئے یہ ضروری ٹھہرا کہ ایک خاص سطح دماغی کا مالک ہو، کیونکہ معمولی سطح کا انسان اس بڑی ذمہ داری کے تحمل سے یکسر قاصر ہے ——— اصابت رائے اور پوری پوری ثقافت کے بغیر اس وادی پر خار میں قدم رکھنا خطرہ سے خالی نہیں۔

کیا غیر مسلم مجتہد ہو سکتا ہے شاطبی کا تفرد

ایک بڑا سوال اس باب کا یہ ہے کہ کیا غیر مسلم بھی مجتہد ہو سکتا ہے ——— علامہ شاطبی کے سوا جمہور کا یہی فیصلہ ہے کہ اجتہاد کے لئے اسلام شرط اوّل ہے ——— شاطبی کا البتہ کہنا ہے، کہ ایقاء شرائط کے ساتھ غیر مسلم بھی اجتہاد کا مجاز ہو سکتا ہے۔ جمہور کی دلیل یہ ہے، کہ اجتہاد نبوت ہی کا ایک حصہ ہے اور اسکے ڈانڈے نبوت کے فرائض سے ملے ہوئے ہیں ——— اس بنا پر یہ ناممکن ہو جاتا ہے، کہ ایک شخص جو ایمان کی چاشنی سے محروم ہو اور حکمت نبوی سے ناآشنا ہو، اس بصیرت و ادراک کا کلاً حاصل ہو سکے جو اجتہاد کیلئے ضروری ہے ——— علاوہ ازیں اسلام کا مزاج صرف آئینی و قانونی نہیں کہ ہر ہر شخص اس کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے بلکہ یہ بیک وقت کئی پہلو اپنے میں رکھتا ہے، اس کے اپنے عقائد ہیں،

اپنی اخلاقی قدریں ہیں، ایک مخصوص نظام اور رنگ ہے، اور پھر قابل لحاظ نکتہ اس ضمن میں یہ ہے، کہ اس کے ایک ایک مسئلہ میں ان سب پہلوؤں کی جھلک اور آمیزش بھی ہے ـــــ اس لئے اس کا معاملہ دوسرے دُنیاوی قوانین سے بالکل الگ ہو جاتا ہے ـــــ کیونکہ دوسرے قوانین بہرآئینہ صرف قوانین ہی ہیں جن میں کوئی اخلاقی و روحانی وحدت نہیں کوئی مابعد الطبعی عوامل کارفرما نہیں اور کوئی عقبیٰ و آخرت کا تصور نہیں لیکن یہاں یہ حال ہے کہ خالص معاملات کی بحثوں میں بھی ان قدروں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

غیر مسلم تقنین میں شریک ہو سکتا ہے:۔ شاطبی کی رائے کا صحیح اور صحتمند محل ہمارے نزدیک دوسرا ہے اور دونوں رایوں میں کوئی تناقض نہیں ـــــ اجتہاد کی جن شرطوں پہ ابھی ابھی بحث کی گئی ہے دراصل وہ مجتہد کی ہیں مطلق اجتہاد کی نہیں اور ان دونوں میں فرق ہے ـــــ مثلاً یہ ہو سکتا ہے، کہ ایک جمہوری اسلامی پارلیمنٹ میں کچھ لوگ ایک ایسے مسئلہ پر غور کریں جو علاوہ دینی پچھواڑ کے خالص دنیاوی بھی ہو ـــــ اس میں علمائے اسلام تو یہ واضح کر دیں کہ دین کا اس سے کیا علاقہ ہے اور اس کے کون کون گوشے دین سے متاثر ہوتے ہیں اور اہل دُنیا یا کچھ غیر مسلم اسکے ان پہلوؤں کو اجاگر کریں، جن کا لگاؤ کلیتہً واقعات اور خارجی دُنیا سے ہے، تو ایسا کرنے کے وہ شرعاً مجاز ہیں۔ بشرطیکہ اس مشورہ میں ان کی شرکت ضروری ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ اس طرح کی ملی فکری و اجتہادی کوششوں سے مسئلہ اور نکھر جائیگا۔ اور تعیین و اطلاق کی ایک لائق عمل شکل اختیار کرے گا ـــــ اس صورت میں محض اس بنا پر کہ پارلیمنٹ کا غیر مسلم رکن اسلام کی نعمت سے بہرہ مند نہیں، حق تقنین سے محروم نہیں رکھا جائیگا، اور اسکی رائے کو عدم اسلام کے عذر پر غیر مقبول قرار نہیں دیا جائے گا ـــــ ہاں یہ البتہ درست ہے، کہ ایسا شخص مجتہد کبھی نہیں کہلائے گا کیونکہ اس کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔

اشتراک فی الاجتہاد کی اس شکل کو ہم خصوصیت سے غور و فکر کے سامنے لانا چاہتے ہیں کہ اب حالات کا تقاضا یہی ہے ـــــ خلافت راشدہ کے بعد سے اسلامی معاشرہ ملوکیت کے تابع رہا، اس لئے اس وقت یہ ممکن ہی نہ تھا، کہ جمہوریت پنپ سکے اور آخر میں حکومت یہ روپ دھار سکے کہ اس کی ذمہ داریوں میں مسلم و غیر مسلم سب شریک ہیں ـــــ لیکن اب سوا جمہوری انداز حکومت کے اور کسی کیلئے گنجائش ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ پورے عالم اسلامی میں اسی نہج کی حکومتیں معرض ظہور میں آ رہی ہیں کیونکہ اسی ڈھب سے عوام کا اعتماد حاصل ہو سکتا ہے اور داخلی و خارجی فتنوں سے بچاؤ ممکن ہے، اسلئے غیر مسلم کو لامحالہ تقنین میں شریک کرنا پڑیگا ـــــ اور جب ان کو حق تقنین دیا جائیگا تو ظاہر ہے کہ انکی رائے اور کاوش کو بشرط صحت مانا بھی جائیگا ـــــ یہی اشتراک فی الاجتہاد ہے۔

مجتہد کیلئے یہ لازم نہیں ہے، کہ علی الاطلاق وہ ہر ہر مسئلہ سے متعلق جانتا ہو، اور زندگی کے ہر ہر گوشے کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہو ـــــ بلکہ اتنا کافی ہے کہ بعض مسائل کی تحقیق اور متعین پہلوؤں کی چھان بین میں اس کی رائے مجتہدانہ ہو ـــــ اور ان گوشوں کی توضیح کے سلسلہ میں ان تمام چیزوں کا علم ہو، جو اس کو مطلوبہ نتائج تک پہنچا سکتی ہیں ـــــ چنانچہ امام مالک سے متعلق بایں جلالت قدر مشہور ہے کہ متعدد سوالات کے جواب میں بلا تکلف یہ فرما دیتے کہ: ـــــ لا ادری (میں نہیں جانتا) ـــــ اور اس سے ان کی شان اجتہاد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

اسلام کن معنوں میں مکمل دین ہے :- اس سے پہلے کہ ہم حجیت اجتہاد کا مبنی بتائیں، یہ ضروری ہے کہ پہلے اس کی دینی و شرعی حیثیت واضح کر دی جائے ——— اسلام ان معنوں میں ایک مکمل دین ہے کہ یہ زندگی کے ہر ہر گوشے سے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے لیکن وہ کبھی اس کا قائل نہیں کہ معاشرہ بجائے خود ساکن ہے اور اس میں کبھی ردوبدل نہیں ہوگا، یا یہ کہ معاشرہ کو ان سطحوں سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے کہ جن سطحوں پر یہ آنحضرت کے زمانہ میں فائز تھا۔

زمانہ رواں دواں ہے، ہر زمانے میں نئے نئے تقاضوں اور نئے نئے مسئلوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے یا کم از کم تغیر پذیر تو ہر آئینہ ہے۔ اس کا کام اس کے مقابلہ میں صرف یہ ہے کہ ان تبدیلیوں میں یہ اسکی ٹھیک ٹھیک راہنمائی کرے اور بتائے کہ ان حالات میں ان مسائل کا حل جو تاریخ کی اضطراری چال سے ابھر آئے ہیں یہ ہے ——— اس کا منصب نہ تو زمانہ کی رفتار روکنا ہے اور نہ یہ ہے کہ زندگی کی عمارت کو معاشرہ کی پرانی بنیادوں ہی پر قائم رکھے ——— اس کا دعویٰ یہ ہے کہ فکر و عمل کے ہر ہر تبدیلی کے باوجود اس کا پیغام ایسا سازگار اور صحیح ہے کہ اس کو اپنائے بنا کوئی چارہ کار نہیں۔

اگر کوئی شخص معاشرہ کے ارتقار کا قائل ہے اور اسے جامد نہیں سمجھتا اور نہ یہ عقیدہ رکھتا ہے، کہ معاشرہ کو ہمیشہ پیچھے کی طرف لوٹنا چاہیئے، تب مذہب کا تصور اسکے نزدیک ہرگز نہیں ہو سکتا کہ پہلے سے وہ اپنی کتاب ہدایت میں ایسی مکمل جزئیات و فروع کا نقشہ رکھتا ہے، کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی زمانہ میں بھی غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی ——— کیونکہ مذہب کے بارے میں یہ عقیدہ وہ شخص رکھ سکتا ہے، جو یا تو اس فطری قانون سے آگاہ نہیں، کہ تاریخ ہمیشہ ورق الٹتی رہتی ہے۔ اور فکر و عمل کی قدریں بدلتی رہتی ہیں، اور وہ مذہب کو ایک زمانہ تک کے لئے محدود سمجھتا ہے۔

اگر ایک شخص ایک طرف اس ہمہ گیر سچائی پر ایمان رکھتا ہے کہ اس دنیا میں تبدیلیوں ہی سے زندگی ہے۔ اور انقلاب و تغیر کی ہوائیں گلشن ہستی میں برابر چلتی رہینگی اور دوسری طرف وہ یہ بھی سمجھتا ہے، کہ کبھی معاشرہ مذہب کی روشنی سے بے نیاز نہیں ہو سکیگا تب اس کا مذہب کے باب میں یقیناً یہ عقیدہ ہوگا، کہ اگرچہ یہ زندگی کا ایک متعین اور نپا تلا نظام ہے اور اس میں تمام ضروری تفصیلات کا تذکرہ ہے، تاہم اس میں کچھ مضمرات ایسے بھی ہیں جن کے اطلاقات نے ہنوز تعیین کی شکل اختیار نہیں کی اور ان کے ظہور پذیر ہونے کا ٹھیک ٹھیک وقت ابھی نہیں آیا ———

مجتہد کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ان مضمرات کو ٹٹولے جو پہلے سے موجود ہیں اور کتاب و سنت کے عمومات سے ایسے زندہ و کارآمد اصول دریافت کرے جن کا وقت کی مناسب جزئیات پر اطلاق ہو سکے ——— اجتہاد کی اس تعبیر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ انسان کی اجتماعی زندگی کیلئے کتنا ضروری ہے اور یہ کہ اسکے بغیر مدنیت و ارتقا کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی ———

ہمارے اسلاف نے جو قیاس و رائے کو مذموم ٹھہرایا ہے، تو اس سے مراد قیاس و رائے کی وہ شکل ہے جو غلط ہے اور جو محض عقل اور ہوائے نفس پر مبنی ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے منقول ہے کہ :-

ای ارض تقلنی وای سماء تظلنی ان قلت فی آیۃ من کتاب اللہ برائی او بما لا اعلم (اعلام)

کون زمین میرا بوجھ اٹھائیگی اور کون آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا اگر میں نے کتاب اللہ میں اپنی رائے سے کچھ کہا یا بغیر علم و آگاہی کے فتوی دیا۔

یا سفیان بن عیینہ کا قول ہے :۔

اجتہاد الرائی ھو مشاورۃ اھل العلم لا ان یقول ھو برایہ ۔ (اعلام)

اجتہاد تو اہل علم کا آپس میں مشورہ کرنا، اور ایک حقیقت کو دریافت کرنا ہے، قول بالرای نہیں ۔

شعبی جن کو ایک سو بیس صحابہؓ سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، ان کا ارشاد ہے :۔

ما جاءکم بہ ھؤلاء من اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فخذوہ وما کان من رائھم فاطرحوہ فی الحش ۔ (اعلام)

تمہیں جو کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے ملے وہ تو لے لو اور جو انکی اپنی رائے ہو اسے گھورے پر پھینک دو۔

ایوب سختیانی کا ایک لطیفہ اس سلسلہ میں خصوصیت سے سننے کا ہے، ان سے کہا گیا :۔ مالک لا تنظر فی الرای۔ (یعنی آپ قیاس و رائے کے بارے میں کیوں غور نہیں کرتے)۔ انہوں نے فوراً جواب میں کہا :۔

قیل للحمار مالک لا تجتر، قال اکرہ مضغ الباطل ۔ (اعلام)

گدھے سے ایک صاحب نے پوچھ لیا، کہ تم جگالی کیوں نہیں کرتے؟ تو اس نے کہا کہ باطل کے چبانے سے مجھے گھن آتی ہے۔

غرض یہ ہے، کہ اسلاف نے جو قیاس و رائے کی مذمت کی، تو اس سے مراد صحیح اور وہ حیات آفرین اجتہاد نہیں جو اجتماعی زندگی کے لئے بمنزلہ تازہ خون اور نئی طاقت کے ہے، بلکہ اس سے مراد وہ قیاس باطل ہے، جس کی تائید کتاب و سنت کی تصریحات سے نہیں ہو پاتی ——— اسی طرح بعض متاخرین نے جو اجتہاد و قیاس کے دروازوں کو بند سمجھا، تو اس کی وجہ اس وقت کے حالات کی یہ بے راہ روی تھی، کہ حکومتیں کمزور اور غیر اسلامی رجحانات کی حامل ہو رہی تھیں۔ عوام میں ہوس دنیا کا غلبہ تھا، عقلی فتنوں نے عقیدوں کی استواری میں کئی کئی رخنے ڈال دیئے تھے اور ہر جاہل و بدعقیدہ آدمی کو حق حاصل تھا، کہ دین کے بارے میں جو چاہے کہے اور جس طرح کی تعبیر چاہے پیش کرے، اس نزاکت احوال کو دیکھ کر فقہا نے دو فتنوں میں سے جو اہون تھا، اس کو پسند کیا، اور ملحدانہ اجتہاد کے مقابلہ میں تقلید و تقیید کی قباحتوں کو ترجیح دی ——— اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ حقیقت ہے، کہ خود وہ فقہائے کرام جنھوں نے اجتہاد کے دروازوں کو سختی سے بند کیا، مسائل میں ترجیح ادلہ سے کام لیتے رہے اور راجح کو مرجوح سے ممیز ٹھہراتے رہے ———

اجتہاد کا مبنی :۔ اس مختصر بحث سے یہ بات ذہن میں آتی ہے، کہ قیاس و اجتہاد کا مبنی تو کتاب و سنت کا اس نہج سے کامل و جامع ہونا ہی ہے، کہ معاشرے کی ترقیات کے ساتھ ساتھ چل سکے اور کسی مرحلہ پر بھی یہ نہ محسوس ہو کہ اب اسکی راہ نمائی ختم ہوتی ہے ——— اصولاً اگر ہم کتاب و سنت میں اس ڈھب کے مضمرات مانتے ہیں، جو زمانہ کی ہر ہر کروٹ پر قوت سے فعل میں آسکے اور نئی روشنی بخش سکتے ہیں، تو قیاس و اجتہاد کی حجیت میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا ——— کیونکہ اجتہاد کی حقیقت یہ نہیں، کہ یہ بالکل ہی نئی دینی

حقیقت پیدا کرتا ہے، یا کسی جدید التزام و فرض کو ضروری ٹھہراتا اور عائد کرتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہی روشنی جو عمومات کتاب و سنّت میں پہلے سے پوشیدہ و مستتر ہوتی ہے اس کو یہ منظر عام پر لے آتی ہے ——— اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس کی حجیت گویا کتاب و سنت ہی کی حجیت کی ایک نوع ہے۔

ابن قیم نے اجتہاد کے دلیل ہونے پر بالکل انوکھے ڈھب سے روشنی ڈالی ہے ان کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم نے عقبیٰ و آخرت کی حیات یا نشاۃ ثانیہ کو ثابت کرنے کیلئے جو اسلوب اختیار کیا ہے، وُہ قیاس ہی کی قبیل کا ہے ——— یعنی اس میں انگھیوں کے اُگنے سے اور بارش کے حیات آفرین چھینٹوں سے مردہ زمین کے زندہ و شاداب ہو جانے سے از سر نو جی اُٹھنے پر استدلال کیا ہے۔

ونزلنا من السماء ماء مبارکاً فانبتنا به جنٰت وحب الحصید والنخل باسقات لها

طلع نضید رزقا للعباد واحیینا به بلدة میتا کذلک الخروج (ق)

اور ہم نے آسمان سے مبارک پانی اُتارا جس سے کہ باغ اُگائے اور اناج کے دانے پیدا کئے جو کاٹے جاتے ہیں اور لمبی لمبی کھجوریں پیدا کیں، جن کے خوشے تہ بہ تہ ہوتے ہیں۔

اور اس استدلال کی منطقی قدر و قیمت اس سے زیادہ نہیں کہ مماثل کو مماثل پر قیاس کیا ہے اور یہی بات بجنسہٖ اجتہاد میں ہوتی ہے کہ ایک مسئلہ میں جب کوئی نص نہ ملے تو پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس کے مماثل کا کیا حکم ہے، اس انداز اثبات کو جو قرآن میں اخروی زندگی کو برسرحق ٹھہرانے کے لئے اختیار کیا گیا ہے، قیاس اشبہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں قیاس و اجتہاد کی حجیت کا سب سے بڑا مبنیٰ یہ حقیقت ہے کہ خود نبوت کی ایک سطح اجتہاد بھی ہے ——— یعنی آنحضرت ؐ نے نصوص کتاب میں برابر غور و فکر اور اجتہاد سے کام لیا ہے اور عمومات سے مخصوصات و جزئیات پر استدلال فرمایا ہے۔

نبوت کی تین سطحیں: ۔ اس اجمال کی طرح سمجھنے کے لئے یہ جاننا نہایت لازمی ہے، کہ نبوت کی تین سطحیں یا فرازہیں: ———

ایک بشریت ——— دوسرے اجتہاد ——— اور تیسرے نبوت

جو لوگ ان تینوں سطحوں کے احکام کو ملحوظ نہیں رکھتے اور ان میں جو باریک فرق ہے اس کو نگاہ میں نہیں رکھتے ان کو بڑی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وُہ یہ نہیں جان پاتے کہ کہاں کہاں آنحضرت ؐ نے سطح بشری سے خطاب فرمایا ہے، کہاں فراز اجتہاد پر فائز ہو کر گفتگو کی ہے اور کہاں سے کہاں تک نبوت کی حکمرانی ہے ——— قرآن و سنّت میں ان تینوں سطحوں کی صاف صاف نشان دہی موجود ہے۔

سطح بشری: بشریت سے متعلق قرآن میں متعدد آیات ہیں جن سب کا منشا اس حقیقت کی وضاحت کرنا ہے کہ انبیاء اپنی جلالت قدر اور اپنے مقامات بلند کے باوجود بہر آئینہ بشر ہی ہوتے ہیں اور کبھی بھی ان تقاضوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے جو بشریت کے لاینفک لوازم میں سے ہیں:

ان نحن الا بشر مثلکم ولکن الله یمن علی من یشاء من عباده ۔ (ابراھیم)

ہم تمہاری ہی طرح کے بشر ہیں، فرق یہ ہے کہ اللہ نبوت سے بہرہ مند کر کے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

قل انما انا بشر مثلکم (حم السجدۃ) | کہہ دیجئے، کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہی ہوں،
ھل کنت الا بشراً رسولاً (بنی اسرائیل) | میں نہیں ہوں، مگر ایک رسول جو بشر ہے۔

انبیاء کے اس سطح پر فائز ہونے کے معنی یہ ہیں، کہ وہ اسی گوشت پوست سے بنے ہیں، جس سے انسان بنتا ہے۔ اسی طرح انکی نفسی و جسمانی ضرورتیں ہیں، جس طرح کہ ایک انسان کی ہوسکتی ہیں اور یہ انہیں مجبوریوں اور احتیاجوں سے دوچار ہوتے ہیں جن کا سامنا عموماً انسان کو صبح و مسا کی زندگی میں کرنا پڑتا ہے ——— سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ عالم الغیب یا عالم الکل نہیں ہوتے، چنانچہ اقلیم رشد و ہدایت کے باہر جو قلمروں دنیا آباد ہے، اس کے بارے میں ان کی معلومات اور تاثرات کا انداز بھی وہی ہوتا ہے جو ہر انسان کا ہوسکتا ہے۔ یہی مطلب ہے آنحضرت کے اس ارشاد کا کہ:

انتم اعلم بامور دنیاکم | تم امور دنیا کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

کیونکہ نبوت کا بہر آئینہ ایک متعین دائرہ ہے، اس دائرے میں نبی سے بڑھ کر اور کوئی شخص اعلم یا افضل یقیناً نہیں ہوسکتا۔ لیکن زندگی و وجود کے کچھ اور دائرے یا علقے بھی ہیں، اور یہ قطعی ضروری نہیں، کہ ان سب کے متعلق بھی انبیاء کی رائے اتنی ہی حجیت و استناد کی متقاضی ہو، جتنی کہ امور دینی میں ———

جس طرح ایک طبیب کا قول فن تعمیر میں، اور ایک شاعر کی بات مصوری میں مستند نہیں ہوتی، اسی طرح پیغمبر جب دائرہ بشریت کی بات کرتا ہے، تو اس کے رد و قبول میں اختیار ہے۔

سطح اجتہاد: بشریت سے آگے کی سطح اجتہاد کی ہے یعنی جب پیغمبر منصوصات کو راہنما نہیں پاتا، تو اس وقت اجتہاد و رائے سے ایک راہ عمل متعین کرلیتا ہے ——— اور پھر مجتہد ہی کی طرح اسکے بھی دونوں پہلو ہوسکتے ہیں۔ ایک وہ جو نبوت کے فرازوں کو چھو آتا ہے، یہ وہ ہے جو ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اور ایک وہ جس میں بشریت کی جھلک ہوتی ہے ——— اسمیں خطا و لغزش کا امکان رہتا ہے ———

لیکن مجتہد کے اجتہاد اور پیغمبر کے اجتہاد میں دو تین بڑے فرق ہیں ——— ایک یہ کہ پیغمبر کی لغزش پر، فوراً تنبیہ ہوتی ہے اور حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف سے صحیح بات سمجھا دی جاتی ہے، جبکہ مجتہد کے بارے میں یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی اجتہادی خطا پر مطلع ہوسکے ———

دوسرے یہ کہ مجتہد مسائل پر جن طریقوں سے غور کرتا ہے، اس کیلئے پہلے کچھ اصول وضع کرتا ہے، کچھ مصطلحات ٹھہراتا ہے اور پھر انکی روشنی میں مسائل و فروع پر استدلال کرتا ہے ——— یا پہلے سے مقررہ و متعین اصولوں کو استدلال و استنباط مسائل میں ملحوظ و مرعی رکھتا ہے اور استدلال میں ان کی نشاندہی کرتا ہے لیکن پیغمبر ایسا نہیں کرتا ——— تیسرے یہ کہ پیغمبر کا دائرہ اجتہاد فروع فقہ تک ہی سمٹا ہوا نہیں رہتا، بلکہ اخلاق و انسانیت کے مسائل تک اس کی تگ و تاز ہے ——— پیغمبر کی رسائی مسائل و فروع تک براہ راست ملکۂ نبوت یا ذوق نبوت کی وجہ سے ہوتی ہے ——— یہی وہ شے ہے، جسے وحی خفی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے ——— اور یہی وہ حقیقت ہے، جس کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارات کئے ہیں:-

ولقد آتینا ابراھیم رشدہ من قبل وکنا بہ عٰلمین۔ (الانبیاء)

اور حضرت ابراہیم کو ہم نے پہلے سے رشد سے نواز رکھا تھا اور ہم اس کی ذہنی صلاحیتوں کو جانتے تھے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ۔ (النساء)

ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے حق و صداقت لیے ہوئے تاکہ تم لوگوں میں ان حقائق کی بنا پر فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں سجھائے ہیں۔

وانزل اللہ علیک الکتٰب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم وکان فضل اللہ علیک عظیما (النساء)

اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی اور تمہیں ایسی ایسی باتوں کی تعلیم دی جن کو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے

رشد، حقائق کو سجھا دینا یا حکمت میں محض الفاظ یا پیرایۂ بیان کا اختلاف ہے ورنہ منشاء و مفہوم سب کا ایک ہی ہے ——— کہ پیغمبر کو صرف کتاب ہی نہیں دی جاتی بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اس کا فہم و بصیرت اور اس کے متعلقات و فروع کو معلوم کرنے کے لئے ایک مخصوص ملکہ یا ذوق بھی عطا کیا جاتا ہے ——— یہی وہ ذوق و ملکہ ہے جس کی روشنی میں پیغمبر پر تبیین و وضاحت اور کھول کھول کر حقائق کو بیان کر دینے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون (النحل)

اور ہم نے تمہاری طرف ذکر و نصیحت سے معمور کتاب اتاری، تاکہ تم کھول کھول کر لوگوں سے وہ مطالب بیان کرو جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں، اور تاکہ وہ ان کی حقانیت پر غور و فکر کریں۔

——— اور اجتہاد کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے، کہ اسی فریضہ تبیین کا یہ ایک گوشہ ہے۔

اجتہاد نبوی کی چند مثالیں : یوں تو دینی مسائل کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کو پہلے آنحضرتؐ نے ازراہ اجتہاد خود معلوم کیا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق فرما دی، یا اس میں اگر کوئی لغزش ہوئی تو اس پر متنبہ فرما دیا۔ لیکن زیادہ سمجھ میں آنے والی چند جستہ جستہ مثالیں یہ ہیں: ———

اس سے قبل کہ نمازوں کے لئے کسی سمت کا تعین ہو، آنحضرتؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور اس میں یہ اصول مدنظر تھا کہ جہاں کوئی متعین راہنمائی نہیں ہے وہاں کیوں نہ پہلے سنن کا تتبع کیا جائے کہ یہ بھی دین کی ایک بنیاد ہے ——— لیکن قلب میں برابر یہ کھٹک رہی کہ ملت ابراہیمی کا امتیاز اہل کتاب سے اس معاملہ میں بہر آئینہ الگ رہنے میں ہے، اس لئے بار بار چاہا کہ اے کاش! بیت المقدس کے بجائے کعبہ ہی کو قبلہ ٹھہرایا جائے ——— اللہ تعالیٰ نے اس کھٹک کو جان لیا اور کعبہ ہی کو قبلہ قرار دے دیا۔

قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضٰھا۔ (البقرہ)

ہم تمہاری اس ادا کو دیکھتے تھے کہ پلٹ پلٹ کر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے، تو ہم اسی قبلہ کی طرف تمہارا رخ کئے دیتے ہیں جو تمہیں پسند ہے

یہ واضح رہے کہ یہاں "پسند" سے مراد ایسی "پسند" ہے جو اس اصول پر مبنی تھی کہ اسلام چونکہ دین ابراہیمی ہی کا تکملہ ہے اور اسی دعوت کا تسلسل ہے، اس لئے شعار و عبادات میں ابراہیمی اسوہ ہی سے اس کی وابستگی ہونا چاہیئے ———

آنحضرتؐ کے زمانہ میں کچھ لوگ وظیفہ جنسی اس طرح ادا کرتے تھے کہ جہاں اس منزل پر پہنچے کہ حظ نفسیاتی پدری تکالیف سے دوچار ہوسکتا ہے، کھیت سے الگ ہوگئے اور مادہ منویہ باہر ہی گرادیا۔ اس فعل کو اصطلاح میں عزل کہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس طرح آدمی گو لطف ازدواج تو اٹھاتا ہے لیکن ذمہ داریوں سے قطعی بچ جاتا ہے۔ آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ اس میں کوئی قباحت تو نہیں آپ نے فرمایا: العزل الواد المخفی۔ (عزل چھوٹے پیمانے پر وأد (زندہ درگور کرنا) ہی تو ہے ــــــ یعنی اس مسئلہ میں آنحضرتؐ نے: ــــــ اذا الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت (التکویر) (جب زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائیگا، کہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی)۔ ــــــ سے استدلال فرمایا

آیت نکاح میں مثنیٰ وثلٰث وربٰع کا ذکر بسبیل استطراد ہے اس سے بظاہر تحدید نہیں نکلتی، کیونکہ جو معنی اس آیت سے متبادر ہوتے ہیں وہ محض کثرت وتعدد کے ہیں۔ تحدید آنحضرتؐ نے جو چار ہی کی تحدید فرمائی تو یہ اجتہاد ہے ــــــ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ کو جب معلوم ہوا کہ غیلان بن سلمہ ثقفی کی دس بیویاں ہیں، تو آپ نے اسے مشورہ دیا کہ چار رکھ لو، باقی کو چھوڑ دو ــــــ اسی قبیل کا یہ قصہ بھی ہے کہ قرآن میں تو دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھنے کی ممانعت ہے لیکن آنحضرتؐ نے خالہ اور بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو بھی اس کے ساتھ ملحق فرمایا۔ کیونکہ دو بہنوں کے معاملہ میں مضرت کا یہ پہلو تھا کہ اس طرح نکاح سے اس رشتہ کو نقصان پہنچتا ہے جو پہلے سے فطرت کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہے اور یہی وجہ حرمت خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کے باب میں بھی موجود ہے۔

اجتہاد نبوی کی کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں آپ منشاء الٰہی کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہ کر پائے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تصحیح کر دی گئی۔ یا ایک رائے اختیار کی اور بعد میں غلطی کے معلوم ہوجانے پر اس سے رجوع کر لیا ــــــ اساری بدر سے متعلق دو رائیں تھیں، ایک یہ کہ بغیر کسی ترابت داری سے متاثر ہوئے انھیں قتل ہی کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ اسکے موید تھے، اور ایک یہ کہ انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے۔ آنحضرتؐ عفو عمیم کے تقاضے سے چھوڑ دینے کے حامی تھے لیکن قرآن نے دوسری رائے کو ترجیح دی:

ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ واللہ عزیز حکیم۔ (انفال)

میدان جنگ میں ٹھہراؤ کی غرض سے ایک جگہ آنحضرتؐ نے پسند فرمائی پوچھا گیا، یہ آپ کی رائے ہے یا تقاضائے وحی ہے۔ آپ نے فرمایا میری رائے ہے۔ تب عرض کیا گیا کہ جنگی چال کے اعتبار سے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ آپ نے اس رائے کو قبول فرمایا اور آگے بڑھ گئے۔

عبداللہ بن ام مکتوم کا واقعہ اگرچہ فقہی نوعیت کا نہیں، مگر بہر آئینہ اس میں بھی آپ نے اجتہاد فرمایا جس کا مبنیٰ غالباً یہ خیال تھا کہ اس وقت صنادید قریش، جو ہمیشہ سے دور دور رہتے، اور اسلام و صاحب اسلام سے بدکتے تھے، اتفاق سے بات سننے پر آمادہ ہیں، پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے کیا خبر کہ چند کلمے ان کی کایا پلٹ دیں، اور خدمت دین کیلئے انھیں تیار کر دیں، کیونکہ فکر و التفات کی مناسبتیں ہر وقت میسر نہیں آتیں اور عبداللہ بن ام مکتوم اپنا آدمی ہے۔ اس کی دل شکنی بھی ہو جائیگی، تو کیا حرج ہے، تبلیغ دین کے سلسلہ میں اتنا ایثار تو ہونا چاہیئے ــــــ اللہ تعالیٰ نے جو علام الغیوب ہے کفار مکہ کے اسلام کو مستبعد قرار دیا اور آنحضرتؐ

کو جتایا کہ یہ نابینا جس کی طرف آپ کی توجہ نہیں ہو سکی دل بینا رکھتا ہے۔ اور ان لوگوں سے کہیں ہدایت سے زیادہ بہرہ مند ہے، لہٰذا اس کے قلب منکسر کی رعایت زیادہ ضروری تھی ——

عبس وتولیٰ، ان جاءہ الاعمیٰ وما یدریك لعلہ یزکی اویذکر فتنفعہ الذکریٰ اما من استغنیٰ فانت لہ تصدی وما علیك الا یزکی واما من جاءك یسعیٰ وھو یخشیٰ فانت عنہ تلھی۔ (عبس)

تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس بنا پہ کہ نابینا آیا اور اس نے مداخلت کی تمہیں کیا معلوم کہ تمہی پاکیزگی حاصل کرے اور نصیحت پا جائے، اور نصیحت پانا اس کے لئے مفید ہی ہو اور وہ جو ہدایت سے بے نیاز ہے تم اس کے درپے ہو، اور اگر وہ پاکیزگی حاصل نہ کرے تو تم پہ کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تم اُس سے بے رخی برتتے ہو۔

نبوت کا مکانکی تصور:- اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے کہ نبوت کی سطحوں میں اجتہاد و فکر کی بھی ایک سطح ہے اور آنحضرتؐ آیات و نصوص میں غور و فکر فرماتے تھے، اور برابر یہ دیکھتے رہتے تھے، کہ کس کس آیت سے دین کے کیا کیا اصول مستنبط ہوتے ہیں، اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں کن کن جزئیات دین پر روشنی پڑتی ہے تو پھر نبوت کا محض مکانکی تصور ہو گا —— جس کے معنی یہ ہوں گے کہ انوار نبوت اور تجلیاتِ رسالت سے آنحضرتؐ کے تمام ذہنی و فکری گوشے مستنیر نہیں ہوئے، اور باوجود اس کے کہ قرآن کے حکم و معارف کا نزول براہ راست آپ کے قلب پر ہوا ہے، اور ایک دُنیا نے اسے تسلیم کیا ہے، اور اہلِ فکر و رائے نے اس سے کلیات کا استنباط کیا ہے اور فروع و جزئیات کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کی ہیں، مگر خود یہ قلب نبوت جس کو کہ ان تمام ہدایات کا سرچشمہ اولیں ہونا چاہیئے تھا ان معارف و حکم سے بے گانہ ہے —— اور اس میں معاذ اللہ! یہ صلاحیت نہیں ابھری کہ اپنے آپ نصوص کتاب سے ان کے وسیع ترین و معین ترین اطلاقات کا سراغ لگا سکے اور یہ فیصلہ کر سکے کہ دین کا تفصیلی ڈھانچہ کیا ہے؟

ایک طبیب جب اصول طب کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، اور علاج و ادویہ کی مناسبتوں پر خوب خوب سوچ بچار کرتا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ یہ معروف و متعین امراض ہی کا لگی بندھی دواؤں سے علاج کرنا سیکھتا ہے، بلکہ اس میں اس کے علاوہ ایک طرح کی فنی قابلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور طبی فہم بھی اُبھرتا ہے جو بالکل شئے زائد ہوتا ہے جس کی مدد سے یہ نئے امراض کا علاج کامیابی سے کر سکتا ہے۔ اور نئی نئی دواؤں کو بھی معرض وجود میں لا سکتا ہے —— جو شخص موسیقی سیکھتا ہے وہ صرف یہی نہیں کرتا کہ پُرانے نغموں کو حلق میں ڈال لے اور جب چاہے ان کو اُگل دے بلکہ موسیقی کی مشق اور ممارست سے اس میں نغمہ آفرینی کی قوتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور نئی نئی آوازوں کو ملانے اور جوڑنے کا سلیقہ بھی پیدا ہوتا ہے —— اسی طرح ایک معمار اور صاحب فن جب اپنے ہنر میں کامیابی پیدا کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کئی تاج محل بن جاتے ہیں۔

جب طبیب کے ساتھ طبی اجتہاد کے اُبھرنے کو آپ مانتے ہیں، موسیقار کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں، کہ وُہ بے شمار ایسے نغموں

کے پیدا کرنے پر قادر رہے۔ جو اس نے نہیں سیکھے' اور ہنرمند ایک تاج محل بنا کر بیکار نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی تخلیقی قوتیں کئی تاج محل بنانے پر قادر رہتی ہیں' تو نبوت کے بارے میں اس رجحانِ مکانیت کو کیوں تسلیم کیا جائے کہ اس سے مجتہدانہ بصیرت پیدا نہیں ہوتی' یا یہ کہ پیغمبر صرف قرآن کی نصوص کو یاد رکھتا ہے۔ اور انہیں کی تبلیغ و اشاعت پر مامور ہے' اور ان نصوص کی روشنی میں فکر اجتہاد کے قدم آگے نہیں بڑھا پاتا ــــ یہ عقیدہ اتنا غیر اسلامی نہیں' جتنا کہ غیر عقلی اور غیر واقعی ہے ــــ کیونکہ جس شخص کے بھیجے میں ذرا بھی عقل ہے' یہ تسلیم نہیں کرے گا' کہ آنحضرتؐ کو نبی تو بنایا گیا ہے' ان کے قلب و دماغ کو مہبطِ وحی بھی ٹھہرایا گیا ہے' قرآن کے حکم و معارف کی تلقین بھی کی گئی ہے اور ان کی فکری و عقلی صلاحیتوں کو جلا بھی بخشی گئی ہے' لیکن آپ نصوص قرآن پر بہر آئینہ کسی تفصیلی اضافے کے مجاز نہیں' اور آپ کو اس بات کا حق نہیں کہ قرآن کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں کوئی مرتب راہِ عمل اختیار کر سکیں ــــ یعنی جو حق آپ ایک طبیب کو دیتے ہیں' ایک ہنرمند اور صاحبِ فن کو بخشتے ہیں اس سے نبی یکسر محروم ہے ــــ اس کا یہ مطلب بھی ہوا' کہ علمِ طب جتنی روشنی پیدا کرتا ہے' اور فن و ہنر سے جس قدر تابش و ضو دماغ میں آتی ہے' نبوت سے اتنا بھی نہیں ہوتا' نہ اس سے دماغ روشنی و طاقت حاصل کرتا ہے اور نہ اجتہاد و فکر کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہنا یہ ہے' کہ فقہی اجتہاد کا ایک مبنیٰ یہ ہے کہ خود آنحضرتؐ نے مسائل میں اجتہاد فرمایا ہے۔

سطحِ نبوت: سطحِ نبوت سے یہ مراد ہے' کہ نبوت کا ایک پہلو من و عن منشاء الٰہی کو اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے انداز میں ظاہر کرنا ہے۔ جب آنحضرتؐ اس فراز و مقام سے خطاب فرماتے' تو اس میں فکر و اجتہاد کی دخل اندازیوں کا تو کیا مذکور' الفاظ تک میں وحی الٰہی کی پابندی ضروری ہو جاتی ہے:

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی ۔ (النجم)

اور محمدؐ کوئی بات بھی ہوائے نفس کے تقاضے سے نہ کرتے بلکہ وہ وحی ہوتی جو ان کی طرف بھیجی جاتی۔

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحیٰ الی انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (یونس)

کہہ دیجئے مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی طرف سے قرآن کو بدل ڈالوں' میں تو صرف اس وحی کا تابع ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے' میں تو نافرمانی کی صورت میں بڑے دن کے عذاب سے خوف محسوس کرتا ہوں۔

یہ تقسیم ہم نے نبوت کے سہ گانہ پہلوؤں کی وضاحت کی غرض سے اختیار کی ہے' ورنہ جہاں تک ماموریہ ہونے کا تعلق ہے اور حجیت و استناد کی بحث ہے' آنحضرتؐ کے وہ اقوال و مجتہدات بھی واجب الاطاعت ہیں جو آپ نے تشریح و توضیح کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں' کیونکہ آپ کے اجتہاد کے معنی صرف اسقدر ہیں کہ ایک حقیقت دینی آپ پر الفاظ و نص کی صورت میں منکشف نہیں ہوتی' بلکہ محض ادراکِ نبوت اور مشکوٰۃ رسالت کے ذریعے آپ پر کھلی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جوں کا توں قائم رکھا ہے اس سے زیادہ نہیں۔

محمد مظہر الدین صدیقی :

اسلام اور ہمارے موجودہ معاشی مسائل

زمانہ حال میں اسلامی معاشیات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ابھی تک اس مسئلہ کا کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا، کہ اسلام کا معاشی مقصود کیا ہے، آیا وہ کمیونسٹوں کی طرح دولت کو اجتماعی ملکیت قرار دیتا ہے یا سرمایہ دارانہ نظام کی مانند لامحدود انفرادی ملکیت کا حامی ہے۔ اس مسئلہ کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے دو تین امور کا لحاظ کرنا پڑیگا، جن کو مدِ نظر نہ رکھنے سے معاملات میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اوّلاً یہ کہ اسلام کمیونزم کی طرح خالص معاشی تحریک نہ تھی۔ اس کی دعوت اخلاق و روحانیت کی تکمیل پر مرتکز تھی۔ اس میں شک نہیں کہ انسان خالص روحانی وجود نہیں، بلکہ جسمانی اور حیوانی تقاضوں سے بھی ایک حد تک مجبور ہے۔ اس لئے اس کے حیوانی عنصر کو نظر انداز کر کے اخلاق و روحانیت کی کوئی تعلیم سرسبز نہیں ہو سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان دو متضاد عناصر میں سے جن سے انسانی وجود کی ترکیب عمل میں آتی ہے زیادہ اہمیت کس کو حاصل ہے جسم کو یا روح کو۔ کمیونزم کو روح کی حقیقت سے انکار ہے یا اگر وہ روح کو تسلیم کرتی ہے تو اس کو ایک ضمنی حیثیت دیتی ہے۔ اس لئے زندگی کے مسائل کو وہ اس مفروضہ پر حل کرنا چاہتی ہے کہ مادّہ اور جسم اصلی معنوں میں حقیقی ہیں۔ ذہن، روح اور شعور ان کی ثانوی پیداوار ہیں۔ اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے مادّی تقاضوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اور اس کے روحانی شعور کی بلندی اور تزکیۂ اخلاق کو مادّی ترقی کا تابع قرار دیا جاتا ہے یعنی اگر سیاسی اور معاشی نظامات کی اصلاح کر لی جائے تو انسانی اخلاق میں خود بخود ترفع پیدا ہو جائیگا۔ اخلاقی ترقی کے لئے کسی مزید جد و جہد کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے، کہ انسان میں روحانیت اور حیوانیت کے دو متضاد عناصر برسرِ پیکار ہیں۔ متضاد ان معنیٰ کہ کے نہیں کہ ان میں کبھی باہم مصالحت نہیں ہو سکتی یا یہ ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے کہ اگر ان دونوں کے درمیان کبھی تصادم واقع ہو، تو روحانی تقاضوں کو جسمانی اور مادّی تقاضوں پر ترجیح دینی ہوگی۔ اسلام جسمانی تقاضوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن انہیں روحی اور شعوری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ ہم آہنگی کسی خاص حالت میں ممکن نہ ہو تو روحانیت کے مقابلہ میں مادّی اور جسمانی مطالبات کو ثانوی درجہ دیا جائیگا۔ اس فلسفۂ حیات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام سیاسی اور معاشی نظامات کی اصلاح کو مبالغہ آمیز اہمیت نہیں دیتا۔ اگرچہ اس کو یہ امر تسلیم ہے کہ انسان کی روحانی ترقی کے لئے بعض مادّی شرائط کی تکمیل ضروری ہے اور جہاں تک سماجی اور سیاسی نظامات روحانیت کی راہ میں حائل ہوں، ان کی اصلاح بھی ضروری ہے لیکن وہ اپنی ساری توقعات سماجی اور سیاسی نظامات کی اصلاح